## Lesson 8: Al-Isra (Ayaat 94-111): Day 32 سُوۡرَةُ بَنِیۡۤ اسرآئیل / الإسرَاء کی تفسیر

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے تاریخ کی کچھ نشانیاں بتاتے ہیں۔

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى تِسۡعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسۡــَٔلۡ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِذۡ جَآءَهُمۡ فَقَالَ لَهٗ فِرۡعَوۡنُ اِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰمُوۡسٰى مَسۡحُوۡرًا ﴿۱۰۱﴾

ہم نے موسیٰؑ کو تو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں اب یہ تم خود بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا کہ "اے موسیٰؑ، میں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحر زدہ آدمی ہے"

شروع میں بنی اسرائیل کی بات تھی، تو اس لیے سورت کے آخر میں پھر بات بنی اسرائیل پر آ گئی۔ کونسی نو نشانیاں تھیں جو سامنے آ گئیں۔ سورۃ الْاَعۡرَاف کی آیت نمبر 130 سے 133 تک، پھلوں کا نقصان، فصلوں کا نقصان، چچڑیاں،، ٹڈی دل، مینڈک، سیلاب اور خون وغیرہ، مصریوں میں جو مختلف عذاب آئے تھے ان کی طرف اشارہ تھا۔ جب عذاب آتا تھا لیکن وہ دوبارہ موسیٰ علیہ السلام سے دعا کروالیتے تھے تو عذاب ٹل جاتا اس کے بعد یہ ہوا کہ فَسۡــَٔلۡ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِذۡ جَآءَهُمۡ تو پھر بنی اسرائیل سے اس زمانے کا حال پوچھیئے، جب موسیٰ ان کے پاس آئے تھے فَقَالَ لَهٗ فِرۡعَوۡنُ اِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰمُوۡسٰى مَسۡحُوۡرًا تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تمہیں اک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں یہ جو تم اپنے طور پہ باتیں کرتے کراتے ہو اس سے ہمیں نہیں لگتا کہ تم نبی ہو ہاں وہ شخص ہو سکتے ہو جس کی مت ماری گئی ہو۔ یاد رکھیے کہ مکہ والے بھی یہی لفظ نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم کے لیے بولتے

تھے۔ اس دور میں اسی سورت کی آیت ہے اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا اور تم پیروی نہیں کرتے مگر ایک سحر زدہ شخص کی۔ ہر دور میں لوگوں نے نبیوں کو جادو گر کہا۔ سورۃ کے شروع میں بھی موسیٰ کا ذکر تھا اور آخر میں بھی ذکر آگیا۔ یہ اسلوب ہمیں قرآن پاک کی ان سورتوں میں ملتا ہے جو ایک ہی خطبے میں نازل ہوئیں۔ اگر ہم کوئی بات شروع کرتے ہیں تو اس کے آخر میں اس بات کا کوئی نہ کوئی خلاصہ ضرور نکالتے ہیں۔ اس سورت میں بنی اسرائیل علیہ السلام کی زندگی کا واقع ہے، جب آپ مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں تھے۔ پھر وہاں سے بلا کر کوہِ طور پر تورات دی گئی۔ آیت نمبر دو میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں نبیوں کے ساتھ ایک جیسے ہی حالات ہوتے ہیں۔ لوگ عموماً کہتے ہیں اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا تم تو ایک جادو گر شخص کی پیروی کرتے ہو۔

قَالَ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَاۤ اَنۡزَلَ هٰۤؤُلَاۤءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰفِرۡعَوۡنُ مَثۡبُوۡرًا ﴿۱۰۲﴾

موسیٰؑ نے اس کے جواب میں کہا "تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں رب السماوات والارض کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں، اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون، تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے"

یعنی جس کو یہ کائنات کی نشانیاں نہیں دِکھ رہی اس کو بھلا یہ یدِبیضا اور عصا کیا دِکھے گا۔ وہ کبھی بھی تورات کی آیتیں نہیں پڑھے گا وَاِنِّىۡ لَاَظُنُّكَ يٰفِرۡعَوۡنُ مَثۡبُوۡرًا اور اے فرعون میں تو تمھیں ایک ہلاکت زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ موسیٰ السلام کا مزاج غصے والا تھا اور پھر آپ بچپن سے ہی فرعون کے ساتھ پلے ہوئے تھے۔ اس لیے یہاں رعب کے انداز میں بلا جھجک کہتے ہیں کہ تم مجھے جادو گر سمجھتے

ہو۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگ ہلاکت میں آئے ہوئے ہو۔ تم تو اپنے آپ کو کچھ بھی کہہ لو، بات یہ ہے کہ میری بات آپ کو اس لئے نہیں سمجھ آتی کہ تم لوگ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾

آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے، مگر ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا۔

تو اس نے ارادہ کیا کہ انھیں زمین سے اکھاڑ کر پھینک دیں اور فرعون نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں اور بنی اسرائیلیوں کو زمین سے اکھاڑ دے، بیٹوں کو قتل کروا دے، بیٹیوں کو زندہ رکھ دے تو پوری قوم کو تباہ کر دے۔ ہم نے کیا کیا؟ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا لیکن ہم نے اس کو جو اس کے ساتھ تھے، سب کو غرق کر دیا۔ اس نے کیا سوچا، اور اللہ نے کیا کر دیا۔ جب لوگ وقت کے مسلمانوں کے ساتھ ظلم کا بازار گرم کرتے ہیں اور وہ مسلمان حقیقی مسلمان ہوں تو اللہ تعالیٰ ایسا ہی کرتا ہے۔ سمندروں کو پھاڑ کر دشمن کو اُس میں پھینک دیتا ہے اور جب ان کو ڈبو یا تو بنی اسرائیل قوم نے کیا کہا۔

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو، پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پورا ہو گا تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے۔

بنی اسرائیل کے فرعون کو اور اس کے ساتھیوں کو ڈبونے کے بعد کہا اسْكُنُوا الْاَرْضَ تم لوگ زمین میں آباد ہو جاؤ۔ اس کے بعد کیا ہو گا، یہ ہے آج کے بنی اسرائیل کا مستقبل۔ قیامت کے قریب یہ

ہو گا۔ یہ اس کے فیوچر کی باتیں ہیں۔فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ اور جب پچھلے وعدے کا وقت آئے گا، اس کا اشارہ قیامت کی طرف ہو گا۔ یا سورت کے شروع میں جو ان کے ساتھ وعدوں کی بات کی تھی اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت آنے والی ہو گی جِئۡنَا بِكُمۡ لَفِيۡفًا تو ہم تم سب کو سمیٹ کر لے آئیں گے وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ سے مراد قیامت کا وعدہ ہے، اور جب قیامت آئے گی تم لوگ جہاں بھی ہو گے ان کو اکٹھا کر کے؛

1۔ میدان حشر میں لے آئیں گے۔ لیکن اس سے اشارہ ملتا ہے کہ قیامت سے پہلے سب یہودیوں کو بنی اسرائیل کہا گیا۔ دنیا کے مختلف کونوں سے اکٹھا کر کے بیت المقدس کے قریب جمع کیا جائے گا۔ آج اسرائیل میں سارے یہود کیوں جمع ہو رہے ہیں، یہ اللہ کا ایک وعدہ پورا ہونے والا ہے۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئیں گے تو سارے یہود اسی ایک کونے میں ہوں گے اور ان کو ڈیل کرنا آسان ہو گا۔

اللہ سبحان تعالیٰ نے یہ اشارہ کر دیا کہ وہ قومیں جو دنیا میں شر اور انتشار پھیلاتی ہیں۔ پھر جب ان کی پکڑ کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع کرتا ہے اور آج کل جو یہود نے مہم چلائی ہوئی ہے پوری دنیا میں جہاں کہیں یہود ہیں ان سب کو اسرائیل کہتے ہیں کہ جب انتشار ہوا تھا تو ان کے دس قبیلے گم ہو گئے تھے۔ پتہ ہی نہیں کہ کہاں گئے۔ آج یہ ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سب سے خاص بات کہ ان میں اتحاد بہت زیادہ ہے۔ تعداد میں چاہے کم ہوتے ہیں لیکن جب یہ سب اکٹھے ہوتے ہیں تو بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے تیز دماغ کو ایک جگہ پر جمع کر رہے ہیں۔

اس سورت کے نزول کے وقت بنی اسرائیل الاسلام کے دور انتشار کے دوران فلسطین سے ان کو بے دخل کئے ہوئے اس عرصہ کو ساڑھے پانچ سو سال ہو گئے تھے۔

پچھلی صدی تک بھی یہ لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ آج تقریباً نصف صدی میں یہ سب دوبارہ جمع ہوں گے۔ یہ گریٹ اسرائیل کا منصوبہ ہے، یہ اس چیز کا نقشہ ہے۔ یہ آج ان آیتوں میں اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ہو سکتا ہے کل کو یہی ان کا قبرستان بن جائے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے دور میں اس قوم کا مقابلہ ڈائریکٹ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہو گا۔

ان آخری آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتا کر ہمیں سمجھا دیا ہے کہ اس قرآن سے ہی تم آنے والے وقت کی باتیں پڑھو گے۔ تم دیکھو گے کہ اللہ نے وہاں تمہارے لیے کیا تیار کیا ہوا ہے۔ آخری آیتوں میں قرآن پاک کا تذکرہ ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۘ﴿۱۰۵﴾

اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے، اور اے محمدؐ، تمہیں ہم نے اِس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے اُسے) متنبہ کر دو۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تا کہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دکھی دلوں پر رم جھم بارش ہو۔ انسانیت جس چیز کی طلب کرتی ہے وہ اسے قرآن سے ہی ملتا ہے لیکن اس سورت میں کتنی دفعہ لفظ حق آیا ہے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا یہ بڑا اہم لفظ ہے۔ حق اس لئے اس کو دو دفعہ خاص طور پہ زور دے کر بیان کیا بالکل وہی انداز ہے اس آیت کا جو سورت طارق کی آیت نمبر 13 اور 14 کا ہے اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۭ یقیناً یہ قرآن قولِ فصیل ہے، یہ کوئی قرآن ہنسی مذاق نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

اِنَّ اللہَ یَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِهٖ اٰخَرِیْنَ یقیناً اللہ اس قرآن کی بدولت کئی قوموں کو ڈھائے گا اور کئی دوسری قوموں کو گرائے گا۔ یہ اصل حق ہے۔ کسی قوم کا عروج یا زوال کا فیصلہ اس حق کو ماننے یا جھٹلانے میں ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کو علامہ اقبال نے بھی کہا تھا۔

کہ وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر ۔۔ اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو

کم از کم اتنا انتشار تو نہ آیا ہوتا جو آج آیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ باہر کے حالات خراب ہیں اور پاکستان کے حالات خراب ہیں, لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان کے خود دل کے حالات خراب ہیں۔ ہم تو اپنی روایات کے پابند بھی نہیں رہے۔ ہمارے ذہنوں میں جو ایک خوبصورت زندگی گزارنے کا نقشہ تھا آج وہ ہماری نسلوں میں بھی نہیں ہے۔ جب کسی چیز کی پہچان تک ہی ختم ہو جائے تو اس میں اسلام نہیں رہتا۔ اصل میں یہاں مسلمانوں کو خبر دی جا رہی ہے کہ بنی اسرائیل کی قوم کیوں ڈوبی۔ کیونکہ

انہوں نے اس کتاب کو پیچھے ہٹا دیا تھا اور اگر آج مسلمانو! تم ڈوبو گے تو صرف اسی وجہ سے ڈوبو گے اور رہی بات اس کتاب کو آہستہ نازل کرنا عَلٰی مُکۡثٍ آرام سے سکون سے فَرَقۡنٰهُ ٹھہرانا تو اس کتاب کو سکون سے پڑھنے کا یہ طریقہ سکھایا گیا ہے۔ خاموشی اور توجہ سے پڑھیں اس کتاب کی عزت کریں، اس کے دوران اپنی سوچ کو نہ بھٹکنے دیں۔

مُکۡثٍ کہتے ہیں انتظار کرتے ہوئے، ٹھہرنے کا معنی ہے، انتظار کرنا، لوگ اللہ کے نبی کے سامنے ایک شبہ پیش کرتے تھے کہ قرآن اگر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو یہ تھوڑا تھوڑا کیوں نازل ہوتا ہے، رک رک کے کیوں آتا ہے، ایک ہی دفعہ ساری وحی آجائے۔ نعوذ باللہ کہ کیا اللہ تعالیٰ سوچ سوچ کر ڈال رہا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں سوچ رہا بلکہ آپ کے اندر اتنا حوصلہ ہی نہیں ہے کہ پورا قرآن اکٹھا لے لو۔ تم اس کتاب کا بوجھ کیسے لے سکتے ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن قلب مومن پر بارش کے قطروں کی طرح ٹپکتا ہے، خوشی دیتا ہے۔ اگر بارش آہستہ ہوتی ہے تو وہ جذب ہو جاتی ہے۔ اگر بارش تیز ہوتی ہے تو اس کی جھل تھل بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دورۂ قرآن کو بھی آپ بارش کی طرح ہی سمجھ لیں بہت سارے لوگوں کے دل بھیگتے ہیں۔ یہ تھوڑی تھوڑی بارش آپ کے دل میں قرآن کو جذب کرتی ہے فَرَقۡنٰهُ، مُکۡثٍ، تَنۡزِيۡلًا یہ تینوں لفظ ایک ہی معنی کے ہیں کہ قرآن کے انداز کو سمجھنا۔

حدیث میں آتا ہے کے جلد بازی تو شیطان کی طرف سے ہے۔

زندگی میں تحمل لانے کی ضرورت ہے۔ پھر کتنی خوبصورت بات ہے کہ قرآن میں تھوڑا تھوڑا یعنی پہلے سورہ فاتحہ، پھر بقرہ پھر آل عمران۔ اس طرح ہر سورت کے آخر میں ایک خوشی ہوتی ہے۔ اگر واقعی

ان خوشیوں کو اپنی زندگی میں جگہ دیں تو آپ کو اپنی زندگی خوبصورت لگے گی۔اب بے نیازی دیکھیے گا اس آیت کا نام "شانِ بے نیازی" رکھ لیجئے۔

قُلۡ اٰمِنُوۡا بِهٖۤ اَوۡ لَا تُؤۡمِنُوۡا ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهٖۤ اِذَا يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ يَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾

اے محمدؐ، اِن لوگوں سے کہہ دو کہ تم اسے مانو یا نہ مانو، جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں۔

اشارہ اسی طرف ہے کہ دیکھو اگر تم مانتے ہو تو مانو، نہیں مانتے تو بہت زیادہ ماننے والے ہیں، بہت زیادہ لوگ اس کتاب سے محبت کرنے والے ہیں اور بہت سے لوگ اس کتاب کی خاطر اپنی زندگیاں صرف کر دیتے ہیں۔اس میں ان علمائے یہود کی طرف اشارہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اسلام دے دیا تھا۔منہ کے بل گرے اس سے مراد یہ ہے کہ جب ہم سجدہ کرتے ہیں تو ماتھے کی طرف جاتے ہیں۔یہاں عاجزی کی طرف اشارہ ہے۔

وَّيَقُوۡلُوۡنَ سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنۡ كَانَ وَعۡدُ رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا‏ ﴿۱۰۸﴾ اور پکار اٹھتے ہیں "پاک ہے ہمارا رب، اُس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا"۔

تو گویا کہ یہاں نبیؐ کو اشارے مل رہے ہیں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے ہی، کہ آپ فکر نہ کیجیے کہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر کے جانے والے ہیں۔وہاں کے لوگوں کو آپ کی خبریں پہنچ چکی ہیں۔سارے لوگ نہیں مانیں گے لیکن ان میں سے کچھ لوگ بنی اسرائیل کے دور کے لوگ بھی تھے جو اس کو مانتے تھے۔عبداللہ بن سلام ان میں آتے ہیں تو انہوں نے اسلام۔۔

کو پڑھا اور ان ساری باتوں کو سمجھا۔

وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴿١٠٩﴾ ۩ السجدہ

اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر اُن کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔

اور قرآن ان کی خوشیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ حالت ہمیں اپنے اندر لانی ہے۔ جب قرآن پڑھتے ہوئے رونا نہیں آتا تو چیک کریں دل کے اندر ہے بھی کہ نہیں۔ جن لوگوں کو قرآن پڑھتے ہوئے بھی اس کے اندر سے وہ چیز نہیں مل رہی ہوتی جو مطلوب ہو تو یاد رکھیں کہ یہ بہت خطرے کی بات ہے۔ ایسی چیزیں انسان کو بہت زیادہ فکر میں ڈالنے والی ہوتی ہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ ۖ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١١٠﴾

اے نبیؐ، اِن سے کہو، اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اُس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔

یعنی نماز پڑھتے ہوئے نہ تو بہت اونچی پڑھو، دعا مانگتے ہوئے نہ تو بہت اونچی بولو اور نہ ہی بہت آہستہ،

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ اور کہہ دیجئے کہ کل حمد اور کل شکر اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ سورت اپنے مضمون کے اعتبار سے سورۃ اخلاص کی ہم وزن ہے۔ اس میں پانچ مختلف انداز میں اللہ کی عظمت اور توحید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کروایا جا رہا ہے۔

1۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔

2۔ دوسری چیز جس نے کوئی اولاد نہیں بنائی سورۃ اخلاص میں اس طرح آتا ہے لَمۡ یَلِدۡ ۙ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ

3۔ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ اس کا کوئی شریک نہیں ہے بادشاہت میں اقتدار اس کا ہے اللہ بے نیاز ہے

4۔ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ اور نہ ہی اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی دوست ہے۔ تم اللہ کی دوستی کو اپنی دوستی پر قیاس نہ کرو۔ تم دوستوں کے محتاج ہو، لیکن اللہ محتاج نہیں۔ لوگوں کی نظریں دوستوں پر لگتی ہیں لیکن اللہ کی نظر کسی پر نہیں۔

5۔ وَکَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا اور اس کی تسبیح کرو جس طرح تکبیر کرنے کا حق ہے۔ یعنی زبان کی نوک سے اللہ اکبر کہنے سے صرف اللہ کی تکبیر نہیں ہوتی۔

عملی تکبیر کرو۔ زبان سے اللہ اکبر کہنا تو تکبیر کا پہلا درجہ ہے۔ کسی نے زبان سے اقرار کیا کہ اللہ سب سے بڑا ہے، اس کے بعد بہت اہم اور کھٹن مرحلے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو انفرادی اور اجتماعی معاملوں میں بڑا کرو اور یہ اس وقت ہو گا جب ہمارے گھروں میں اللہ اکبر کی آواز آئے گی۔ گھر کے معاملات میں اس کی بات مانی جائے گی، ہماری پارلیمنٹ میں بھی اس کی بات کو مانا جائے گا، ہمارا قانون اور ہماری شریعت اس کے مطابق بنے گی، عدالتوں میں جب اللہ اکبر ہو گا تو فیصلے اس کے مطابق ہونگے۔ پھر

وَکَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی ظالم ہیں اور وہی فاسق ہیں اور کافر ہیں۔

توخود اپنی ذات سے پوچھو کہ کیا اللہ ہمارے گھر میں سب سے بڑا ہے۔ ہمارے گھر کے معاملے میں اللہ کی ذات بڑی ہے یا بیوی بڑی ہے، شوہر بڑا ہے یا اس کے علاوہ بچے بڑے ہیں۔ یہ بات بہت بڑی بات ہے۔ سورہ شروع کہاں سے ہوئی تھی سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی اور اس کے آخر میں یہ ہے وَکَبِّرۡہُ تَکۡبِیۡرًا اللہ اکبر اسی طرح اگلی سورت بھی اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ سے شروع ہو رہی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے دشمن نہیں ہیں۔ یہاں بھی قرآن پاک میں ان لوگوں پر تنقید ہوئی تو یہ ان لوگوں کے اپنے رویے تھے۔ ہم سب لوگوں کے لئے بھی اس میں ایک عمل کی بات ہے کہ جب کوئی ہمارا اپنا ماں باپ، بہن بھائی حتیٰ کہ بچپن میں والدین کی تنقید بہت بری لگتی ہے تو اس وقت ان کی بات پر غصہ کرنے کے بجائے یہ سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے، سوچنا بھی چاہیے کہ آخر اس نے یہ مجھے ہی ایسا کیوں کہا۔ کسی دوسرے کو ایسا کیوں نہیں کہا اور دوسری بات آنکھوں کا تر ہونا۔ اس سے مراد رونا ہے۔

یاد رکھیے جن کے دل سخت ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں بھی خشک ہوتی ہیں۔ ہم سب اپنی آنکھوں کو دیکھیں کہ ہمارا درجہ قرآن کے ساتھ کس طرح کا ہے۔ ایک طرف نجاشی اور اس کے درباریوں کی مثال اور دوسری طرف ان علمائے یہود کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت موجود تھے۔ وہ قرآن کی آیتوں کو سنتے تھے اور ان کی یہ حالت تھی اگر ہم اصطلاحی سجدہ نہ کریں تو عاجزی بہر حال سجدے کے اندر آتی ہے۔ گویا سبحان اللہ نے یہاں ان کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وَیَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ یَبۡکُوۡنَ وَیَزِیۡدُہُمۡ یہ وہ تین تاثرات ہیں جو قرآن پڑھنے کے بعد ہمارے بھی ہونے چاہیں۔ اپنے لئے ایک چیک لسٹ بنالیں کہ کیا میں تھک تو نہیں گئی اور قرآن پڑھ پڑھ کے اور ہر وقت دوسروں پر تنقید تو

نہیں کرتی ہوں یَبۡکُوۡنَ وَیَزِیۡدُھُمۡ خُشُوۡعًا ۔ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا پھر ایک اور سوال خود سے پوچھتے ہیں کہ قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ میری نمازیں کیسی ہوئیں؟ کیا میرے قرآن پڑھنے سے میری نمازوں کو فائدہ ہوا، یا کیا میں اپنی نماز میں بہتری محسوس کرتی ہوں۔

پھر اسی طرح دیکھیے کہ ایک اور آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ کام کروالیتے ہیں جس کو وہ بظاہر دکھانے کے لئے کرتا ہے، تو یہ اس کے لیے نقصان ہوتا ہے۔ آج ساری دنیا کے اندر سارے گروہ کا جمع ہونا اصل میں ان کا اپنا ذاتی فائدہ ہے، لیکن دیکھا جائے تو یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشن کو مضبوط کر رہا ہے۔ یہ جو لفظ ہے لَفِیۡفًا اردو میں ہم جس کو لفافہ کہتے ہیں۔ لفیف کہتے ہیں آدمیوں کا ایک بڑا گروہ جس میں مختلف قبائل کے لوگ ہوں۔ اسی طرح دو یا دو سے زیادہ اقسام کا ملایا ہوا کھانا۔ کبھی کبھی ہم دو کھانے رکھتے ہیں اور آج انگلش کی ٹیکسٹ میں سمجھیں تو اس کو پلیٹر کہتے ہیں۔ پلیٹر میں ہر طرح کی تھوڑی تھوڑی چیز ہوتی ہیں۔ اس کو بھی لفیف کہتے ہیں قرآن پاک میں یہ لفظ آتا ہے وَّجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا اور جنت ان کے قریب کر دی جائے گی۔ یا ان کے بالکل پاس ہو جائے گی۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک ہی لفظ میں بہت خوبصورت باتیں ہمارے سامنے رکھ دی پھر اس کے بعد آیت نمبر 110 میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کے بارے میں مشرکین مکہ کی بات تھی اس کی طرف اشارہ تھا۔ بسم اللہ کہتے تھے اور الرحمٰن کو نہیں مانتے تھے یہ بھی ایک عجیب سی بات ہے کہ لفظ الرحمٰن میں اتنی محبت ہے کہ اس کو سنتے ہی دل میں پیار سے بھر جاتا ہے، لیکن جب ہم الرحمن کی بجائے بِسم اللہ الرحمن الرحیم کہتے ہیں تو اس پر مکہ والے مایوس ہو جاتے تھے، برا مناتے تھے، تو اللہ

تعالیٰ نے اسی کے اوپر بات کر دی کہ تم اللہ تعالیٰ کے ناموں کے اوپر میجک سٹیم رویہ نہ رکھو پھر ہمیں ایک اور بات معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں خشوع رکھنے کے لیے کبھی تھوڑی اونچی اور کبھی آہستہ آواز میں تلاوت کرنی چاہیے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم خود سنیں، جب ہم خود سنتے ہیں تو اس سے ہماری توجہ رہتی ہے۔ بعض دفعہ ہم اتنا آہستہ پڑھتے ہیں کہ ہماری زبان بھی نہیں ہلتی، ہونٹ نہیں ملتے۔ شاید اندر زبان تو ہلتی ہو گی پھر اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہماری توجہ ہٹنے لگتی ہے اور بعض اوقات کوئی اتنا اونچی پڑھنے لگ جاتا ہے کہ دوسروں کو بھی ڈسٹرب کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ بہت آہستہ آواز میں تہجد پڑھ رہے تھے یعنی نفل نماز کا ذکر ہے۔ پھر آگے گئے تو حضرت عمر کو دیکھا کہ وہ بہت اونچی آواز میں پڑھ رہے تھے۔ بعد میں آپؐ نے پوچھا کہ اے ابو بکر آپ اتنی آہستہ آواز میں کیوں پڑھ رہے تھے تو انہوں نے جواب دیا ہے اللہ کے نبی میں جس رب سے التجا کر رہا تھا وہ آہستہ آواز بھی سن لیتا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں بھی آتا ہے کہ اگر پکار کر کہوں یا دھیمی آواز میں کہو، وہ سب باتیں سنتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ سو رہے تھے ان کا خیال کر رہا تھا اور جب حضرت عمر فاروق سے پوچھا کہ آپ اونچی آواز میں کیوں پڑھ رہے تو کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم شیطان کو بھگا رہا تھا اور ساتھ ہی سوئے ہوئے لوگوں کو جگا رہا تھا۔ یہ ہے شاقلہ، کچھ لوگوں کی شاقلہ حضرت ابو بکر جیسی اور کچھ لوگوں کے حضرت عمر فاروق جیسی ہے۔ آپؐ نے حضرت ابو بکر سے کہا کہ تھوڑا سا اونچی پڑھا کریں اور حضرت عمر فاروق سے کہا کہ آپ تھوڑا سا آہستہ پڑھا کریں، اس کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑی سی اصلاح کر دینی چاہیے۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یہاں صَلَاتِكَ سے مراد دعا ہے۔ دعا مانگتے ہوئے بھی آواز نہ تو بہت زیادہ چیخنے والی ہو اور نہ ہی بہت زیادہ دبی ہوئی آواز ہونی چاہیے۔ خاص طور پر جب کچھ لوگ اجتماعی دعائیں کرتے ہوں تو اس کے دوران کبھی اللہ تعالیٰ کو حکم دینے کا انداز ہوتا ہے، کبھی ہوس والا اور کبھی دھاندلی والا اور کہتے ہیں کہ اے اللہ تو بس آ جا، ہم آپ کو ہی پکارتے ہیں، ایسے الفاظ اسلام میں پسندیدہ نہیں ہیں۔

آخری آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد تھی اور وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا کمزور روایتوں کے تحت اس آیت کا نام عزت ہے۔ عزت کی آیتیں اور صحابہ کا اس میں عمل بھی دکھتا ہے کہ وہ بہت ہی کمزور حال میں تھے۔ وہ بہت پریشان اور ذہنی اضطراب میں تھے حتیٰ کہ یہ لفظ تو ان کے لیے بولتے ہوئے بھی اچھے نہیں لگتے لیکن اللہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ آپ ان آیتوں کی تلاوت کیا کریں۔ جب انہوں نے ان آیتوں کی تلاوت کی تو ان کی حالت بہتر ہو گئی۔ یہ روایت تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دل کو کیا ہو گیا، اب قرآن صرف برائے نام رہ گیا ہے۔ پڑھنا برائے پڑھنا، یاد کرنا برائے یاد کرنا، ٹیسٹ دینا برائے ٹیسٹ دینا، لفظ عادت میں اور لفظ عبادت میں فرق ہونا چاہیئے۔ عبادت کو جب عبادت سمجھ کر کرتے ہیں تو اس میں خشوع آتا ہے اور اس کے اندر دل لگا رہتا ہے لیکن جب عبادت کو عادت بنا لیتے ہیں تو بعض دفعہ اس میں سے ہماری روح نکل جاتی ہے۔ تو ہم اس کو کرنا پسند نہیں کرتے۔

تو دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین